Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

Acritical Analysis of The Cultural and Civilizational Heritage of Baltistan In the Context of Its Historical Omprints

نقوشِ بلتستان کے تناظر میں بلتستان کے تہذیبی و ثقافتی ورثے کا تنقیدی جائزہ

Dr Muhammad Nazir
Lecturer Urdu, Uswa Girls College, Skardu
Email: nazirurdu1@gmail.com

Muhammad
Principal, Uswa Girls College, Skardu
Email: menaseem4u@gmail.com

Dr Muhammad Naseem Akhtar
Social Work Administrator, Uswa Boys College, Yultar
Email: drmnaseemakhtar@gmail.com

Abstract

Geographical factors are not the only ones that define the identity of any community, society or region. Instead it has been created by a complex process of historical, religious, cultural, language, literary heritage, architectural, social, traditional and collective memory. Historical monuments of a region are tangible symbols of its history, while its customs and traditions, religious institutions, language, literary heritage and collective memories reflect its intangible cultural heritage. This is not only a land of towering mountains, picturesque valleys and breathtaking natural landscapes, but also a region of an ancient and layered cultural history, which is diverse and multifaceted.

Throughout Baltistan, it is possible to find evidence to various stages of Baltistan's historical development in the old forts, palaces, mosques, khanqahs, imambargahs, sacred places, historical gardens and rock inscriptions. The tangible and intangible survivals are important clues to the past of this region and make a link to the historical processes which have moulded the cultural identity of the present day Baltistan. The study, therefore, examines the historical value and cultural importance of these heritage sites and how they contribute to the preservation and representation of the collective memory, traditions and civilizational heritage of the region. It specially emphasizes on the contribution of these monuments and cultural places to the understanding of the historical continuity and unique cultural identity of Baltistan.

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

Keywords: Kharpocho, Chopal, Hilchungra, Khanqah, Chaqchan, Tozhe, Culture and Heritage, Civilization, Gardens, Imambargah, Mosques, Qatl Gah, Jamia Mosque, Shah Mahmood Astana, Gonpa, Buddhist Monuments

تاریخ کسی قوم کے ماضی کا صرف احوال نہیں بلکہ اس کے مشترکہ ادراک، پہچان اور تہذیبی یادداشت کی تشکیل کا بنیادی وسیلہ ہے۔ ملتیں اپنے ماضی کے مشاہدات،، رسم ورواج، مذہبی عقائد، سیاسی تغیر و تبدل اور ثقافتی مظاہر کے ذریعے اپنی پہچان مستحکم کرتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کسی علاقے کی تمدن کو جاننے کے لیے صرف اس کی سیاسی تاریخ کا جائزہ کافی نہیں بلکہ اس کے تاریخی نشانات دینی ادارے، طرزِ تعمیر، زبان، ادبی سرمایہ، روایات اور مشترکہ یادداشت کو بھی مد نظر رکھنا اہم ہے۔ تاریخ اور تہذیب کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دیکھنے کی کاوش کسی علاقے کی جامع تاریخی صورت پیش نہیں کر سکتی، کیونکہ ماضی کے حالات جس سماج میں رونما ہوتے ہیں، وہیں سے اس سماج کی تمدنی ترکیب بھی وجود میں آتی ہے۔ تہذیب کا تعلق محض بیرونی طرزِ حیات، عمارتوں یا فنِ تعمیر سے نہیں بلکہ انسانی سماج کے ذہنی، دینی، اخلاقی، معاشرتی اور ثقافتی مشاہدات سے بھی ہے۔ کسی علاقے کے تہذیبی میراث کا جائزہ کرتے ہوئے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہاں موجود تاریخی نشانات کن حالات میں قائم ہوئے، ان کا تعلق کن معاشرتی و مذہبی ضروریات سے تھا، وقت کے ساتھ ان کی اہمیت میں کیا تبدیلیاں آئیں اور آج وہ مقامی باشندگان کے مشترکہ یاداشت میں کس حیثیت سے موجود ہیں۔ اسی نقطہ نظر سے خطہ بلتستان کا جائزہ نہایت ضروری ہو جاتا ہے، کیونکہ یہاں تاریخ اور تہذیب ایک دوسرے میں اس طرح جڑی ہوئی نظر آتی ہیں کہ کسی ایک کو دوسرے سے جدا کرنا کٹھن معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ اور تہذیب کے باہمی رابطے کے ضمن سے مختلف دانش وروں نے اپنے اپنے طریقے سے بحث کی ہے۔ آرنلڈ جوزف ٹائن بی نے تاریخ کے جائزے میں تہذیبی اجزاء اور ان کے مشترکہ تاریخی مشاہدات کو اہمیت دی، جب کہ سید سبط حسن نے تاریخ، سماج، انسانی خیال اور تہذیبی بناوٹ کے باہمی تعلقات کو اپنی تحریروں میں بحث کا مرکز بنایا۔ اردو ادب کے نامور محقق اور ناقد ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں بھی تہذیبی و تمدنی، ثقافتوں، زبان اور سماج کے تاریخی و فکری پس منظر سے متعلق اہم بحثیں ملتے ہیں۔ ان فکری مباحث کی روشنی میں جب کسی علاقے کے تہذیبی ورثے کا جائزہ کیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تاریخی باقیات دراصل ایک سماج کے مشترکہ مشاہدات کے ظاہری نمونے ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں آرنلڈ جے۔ ٹائن بی لکھتے ہیں کہ

"لیکن یورپ کی کوئی ایک قوم یا قومی سلطنت ایسی تاریخ نہیں پیش کر سکتی جو اپنی شارح آپ ہو، یعنی اسے سمجھنے کے لیے کسی دوسرے ملک کی تاریخ کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔"(1)

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

تاریخ کے اسی باہمی اور جڑے ہوئے خیال کو تہذیب کے وسیع تر معنی کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو سید سبط حسن کی یہ وضاحت خاص اہمیت اختیار کرتی ہے۔

"کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ تہذیب معاشرے کی طرزِ زندگی اور طرزِ فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے۔ چنانچہ زبان، آلات و اوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے، رہن سہن، فنونِ لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد و افکار، اخلاق و عادات، رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔"(2)

اسی مفاہیم کو ڈاکٹر جمیل جالبی تہذیب و ثقافت کے ضمن میں یوں لکھتے ہیں کہ

"کلچر کسی قوم یا معاشرے کی وہ مشترک خصوصیت ہے جس سے نہ صرف ہم اسے پہچانتے ہیں بلکہ دوسرے معاشروں اور قوموں سے ممیز بھی کرتے ہیں۔ کلچر کی اقدار بحیثیت مجموعی اپنے عاملوں کو ذاتی مفاد سے بلند تر کر دیتی ہیں اور وہ اقدار، دلچسپیوں اور مقاصد میں اس درجہ محو ہو جاتے ہیں۔"(3)

فیض احمد فیض بھی تہذیب اور ثقافت کے باہمی تعلق کو روشن کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ

"ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے، اس کے آداب اور اس کے اخلاق ظاہری اور تیسرے اس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس معاشرے میں لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہ معاشرہ جن چیزوں کو عزیز رکھتا ہے یا جن کو مقدس یا مستحسن سمجھتا ہے، اس کے مطابق وہ اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر جب اس معاشرے کی صورت اور اس کے حالات بدلتے ہیں تو یہ اقدار بھی اس کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔"(4)

ان فکری مباحث کی روشنی میں بلتستان کے تہذیبی میراث کو دیکھا جائے تو یہ خطہ محض قدرتی خوب صورتی کا حامل علاقہ نہیں بلکہ صدیوں پر محیط انسانی سرگرمیوں، مذہبی سرگرمیوں، سیاسی تغیر و تبدل اور ثقافتی میل جول کا محافظ ہے۔ یہاں کے تاریخی نشانات اس بات کے گواہ ہیں کہ مختلف زمانوں میں اس خطے میں مذہبی، سیاسی اور معاشرتی بنیاد پر تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی رہی ہیں اور ان تبدیلیوں کے آثار آج بھی مقامی سماج، دینی مراکز، طرزِ تعمیر، لسان، رسم و رواج اور تاریخی یادداشت میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ سرزمین بلتستان کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ محض خوب صورت بلند و بالا پہاڑوں اور وادیوں کا علاقہ نہیں بلکہ ایک زندہ و جاوید تاریخ کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہاں کی مساجد، خانقاہیں، قلعے، امام بارگاہیں، زیارت گاہیں اور چٹانوں پر کندہ کیے ہوئے نشانات صدیوں پر پھیلی ایک تہذیبی و ثقافتی کہانی سناتے

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

ہیں۔ان باقیات میں مذہبی عقائد، سیاسی اقتدار، مقامی فنِ تعمیر، معاشرتی نظام اور مشترکہ حافظے کے مختلف گوشے ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔یہی ورثہ اس خطے کو ایک منفرد تاریخی پہچان فراہم کرتا ہے۔حسن حسرت نے اپنی کتاب ''نقوشِ بلتستان'' میں اسی تاریخی، تمدنی اور ثقافتی ورثے کو ریکارڈ رکھنے کی ایک سنجیدہ کاوش کی ہے۔وہ ایک کثیر الجہت ادیب ہیں اور مختلف نثری اصناف میں طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے موضوعات پر بھی کام کرتے رہے ہیں۔ان کی تحاریر میں سرزمین بلتستان کی روح اور مقامی تہذیبی شعور کی عکاسی واضح ہوتی ہے اور یہی خوبی ''نقوشِ بلتستان'' کو قابل قدر کتاب بناتی ہے۔یہ کتاب 161 صفحات اور دس ابواب پر مبنی ہے۔مصنف نے اس کتاب میں آسان اور مربوط انداز میں بلتستان کا جغرافیائی تعارف، تاریخ، مذہبی ارتقا اور تہذیبی و ثقافتی ورثہ واضح کیا ہے۔کتاب میں موجود تصاویر بھی اس کی دستاویزی اہمیت بڑھا دیتی ہیں۔کتاب کی ابتدا بلتستان کے جغرافیائی تعارف سے ہوتی ہے۔کسی بھی علاقے کی تاریخ اور تہذیبی تمدن کو جاننے کے لیے اس کے جغرافیائی پس منظر کو نظروں سے اوجھل نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ پہاڑ، ندی، درے، گزرگاہیں اور قدرتی ماحول انسانی بستیوں کی تشکیل، ان کے باہمی تعلقات اور سیاسی و معاشی سرگرمیوں پر اثرانداز ہوتے ہیں۔اس لیے کتاب کی شروعات جغرافیائی تعارف سے کرنا مصنف کے انداز تحقیق کی مناسبت کو واضح کرتا ہے۔جغرافیے کے بعد بلتستان کے قدیم ادیان، حکمرانوں اور مختلف تاریخی زمانوں کا بیان آتا ہے۔ڈوگرہ زمانے اور اس کے بعد کے سیاسی و دستوری حالات تک کے سفر کو بھی مصنف نے اپنی صلاحیت کے مطابق بیان کیا ہے۔اس طرح کتاب محض تاریخی عمارتوں کے تعارف تک منحصر نہیں رہتی بلکہ بلتستان کے تاریخی سفر کی ایک بنیادی صورت بھی پیش کرتی ہے۔

یہ تاریخی پس منظر اس وقت مزید روشن ہوتا ہے جب مصنف مذہبی مراکز اور تاریخی عمارتوں کی طرف آتے ہیں۔کتاب کے وسط حصے میں کہیں قدیم مذہبی نشانات کا احوال ملتا ہے، کہیں پرانی طرزِ تعمیر کی منظر سامنے آتی ہے اور کہیں مذہبی اداروں کے تاریخی کردار کی طرف نشان دہی کیا جاتا ہے۔مساجد، خانقاہوں اور امام بارگاہوں کے بارے میں بحثیں نہ صرف مذہبی تاریخ کو سامنے لاتے ہیں بلکہ ان کے ذریعے سماجی تبدیلیوں اور اجتماعی زندگی کے منفرد گوشے بھی نمایاں ہوتے ہیں۔اس اعتبار سے ''نقوشِ بلتستان'' کو مقامی تاریخ، مذہبی تاریخ اور تہذیبی و ثقافتی مطالعے کے درمیان ایک رابطے کی حیثیت سے بھی پرکھا جاسکتا ہے۔اسی سلسلے میں باب پنجم خصوصی اہمیت رکھتا ہے، جہاں مصنف نے ستائیس تاریخی مساجد کا تعارف پیش کیا ہے۔ان میں چقچن، امبوڑک، توڑے اور میر خاتون کھرپوچو مسجد شامل ہیں۔ان مساجد کی اہمیت محض عبادت گاہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے بھی ہے کہ یہ بلتستان کے مذہبی، معاشرتی اور تعمیراتی ماضی کی نشانیاں ہیں۔مسجد چقچن کے بارے میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہاں پہلے بدھ مت کا عبادت گاہ قائم تھا جو سید علی ہمدانی کی تبلیغِ دین کے بعد مسجد میں تبدیل ہوا۔اس روایت کو

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

تاریخی تحقیق میں استعمال کرتے وقت اصل ماخذ، مقامی روایت اور دیگر تاریخی دلائل کے باہمی موازنہ کو مدنظر رکھنا ناگزیر ہے۔ تاہم یہ روایت بہرصورت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مذہبی تبدیلیاں صرف عقائد کی تبدیلی تک منحصر نہیں رہتیں بلکہ وہ جگہیں، عمارات اور اجتماعی علامتوں کو بھی نئے مفاہیم فراہم کرتی ہیں۔

اس تناظر میں حسن حسرت صاحب لکھتے ہیں کہ

"1362ء سے قبل اس مسجد کی جگہ بدھ مت کا گومپہ قائم تھا۔ حضرت شاہ ہمدان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر جب یہاں پوری آبادی مسلمان ہو گئی تو یہاں مسجد تعمیر کی گئی۔ بتایا جاتا ہے کہ اس مسجد کی تکمیل کئی مراحل میں ہوئی تھی۔ اصل عمارت کی بنیاد تو میر سید علی ہمدانی نے ۷۸۳ ہجری میں رکھی تھی۔

بعد ازاں مرحلہ وار اس عمارت میں اضافہ ہوتا گیا اور روایت کے مطابق ۱۲۳ سال میں اس کی تعمیر کا کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ۱۹۲۳ء میں مسجد کی بڑے پیمانے پر مرمت ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۸ء میں اس مسجد کی مرمت کا کام کیا گیا۔"(5)

مسجد امبوڑک شگر کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ

"شگر میں واقع مسجد امبوڑک بھی حضرت شاہ ہمدان کے روحانی انقلاب کی یادگار ہے جس کی بنیاد بعض محققین کے مطابق ۷۸۲ھ میں جبکہ بعض کے مطابق ۷۸۵ھ مطابق ۱۳۸۳ء میں خود امیر کبیر سید علی ہمدانی نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی۔"(6)

یہاں بھی مصنف نے تاریخی روایت کو محفوظ کرنے کی کاوش کی ہے، تاہم مختلف تاریخوں کے اختلاف کی موجودگی اس بات کی متقاضی ہے کہ آئندہ ریسرچ میں ان روایات کا بنیادی تاریخی مصادر کی روشنی میں تقابلی جائزہ لیا جائے۔ مساجد کے بعد جب بلتستان کی مذہبی تاریخ کے دوسرے اداروں کی طرف توجہ کی جاتی ہے تو خانقاہیں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔ بلتستان کی تہذیبی تاریخ میں خانقاہوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ خانقاہ صرف عبادت یا روحانی تربیت کی جگہ نہیں بلکہ کئی سماج میں تعلیم، مذہبی رہنمائی، معاشرتی رابطے اور عوامی اجتماع کا محور بھی رہی ہے۔ کتاب میں چودہ خانقاہوں کے حوالے سے مختصر پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں خانقاہِ معلیٰ گمبہ سکردو، خانقاہ شگر، خپلو، کورو اور آستانہ طولتی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خانقاہِ معلیٰ گمبہ سکردو کے بارے میں کتاب میں اسے بلتستان کی ابتدائی خانقاہوں میں شمار کرتے ہوئے اس کی اساس سید علی ہمدانی سے منسوب کی گئی ہے اور اس کے قیام کا دور 783 ہجری ذکر کیا گیا ہے۔ ایسے تاریخی دعووں کے لیے اصل ماخذ، کتبے،

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

مقامی روایت اور دیگر تاریخی ماخذ کا تقابلی جائزہ اہم ہے۔اس کے باوجود خانقاہوں کا یہ تعارف اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس سے بلتستان کے مذہبی اور روحانی مراکز کا ایک ابتدائی خاکہ سامنے آتا ہے۔

حسن حسرت صاحب لکھتے ہیں کہ

"اس خانقاہ کو مبینہ طور پر بلتستان کی سرزمین پر پہلی خانقاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔کیونکہ بروایت اس کی بنیاد سب سے پہلے امیر کبیر سید علی ہمدانی نے غالباً ۷۸۳ ہجری میں رکھی تھی۔"(7)

مصنف اس خانقاہ کی تعمیر نو سے متعلق منظوم تاریخ بھی نقل کرتے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخی عمارات کے ساتھ کتبوں، اشعار اور مقامی ادبی روایت کو بھی انہوں نے اہمیت دی ہے۔

خانقاہوں کے عمومی کردار کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں

"بلتستان میں اشاعتِ اسلام کے اوائل میں صوفیائے کرام اور مبلغین عظام نے مسجدوں کے علاوہ جگہ جگہ خانقاہیں بھی قائم کیں۔بتایا جاتا ہے کہ خانقاہ کی یہ ترکیب خان اور قاہ سے بنی ہے جس کے معنی ہیں خانہ خدا کی جگہ یا مکان۔

خردنامہ جلال پوری کے مطابق 'خانقاہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔پہلوی میں خانگاہ بنا۔معرب ہوا تو خانقاہ کہنے لگے۔"(8)

خانقاہ شگر کے بارے میں یوں لکھتے ہیں کہ

"بلتستان کی تاریخی خانقاہوں میں سے ایک شگر کی خانقاہ ہے جس کی تعمیر سید شاہ ناصر طوسی سے منسوب ہے۔یہ دیدہ زیب عمارت شگر کے بائیں جانب اور شاہراہ عام کی مغربی سمت میں موجود ہے۔تبلیغ اسلام کے سلسلے میں بلتستان تشریف لانے والے بزرگوں میں سے طوسی برادران کے نام زبان زد عام ہیں۔"(9)

اسی مذہبی اور معاشرتی تسلسل میں امام بارگاہیں بھی بلتستان کی تہذیبی و تمدنی پہچان کا ایک اہم حصہ بن کر سامنے آتی ہیں۔کتاب میں بلتستان کی دس قدیم امام بارگاہوں کا احوال پیش کیا گیا ہے۔یہ مقامات مذہبی اجتماعات کے مراکز ہونے کے ساتھ ساتھ مقامی آبادی کے اجتماعی حافظے، مذہبی شناخت اور سماجی روابط سے بھی گہرا تعلق رکھتے ہیں۔امام بارگاہ کھرمنگ بیامہ بلتستان کے قدیم ترین امام بارگاہوں میں شمار کیا گیا ہے اور اس کی تعمیر 1819ء میں کھرمنگ کے راجا علی شیر خان کے دور سے منسوب کی گئی ہے۔

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

امام بارگاہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"امام بارگاہ کھرمنگ بیامہ یہ امام بارگاہ ۱۲۳۵ ہجری میں کھرمنگ کے مقپون راجہ علی شیر خان کے دور میں ان کی دختر نیک اختر بادشاہ بیگم کے حکم سے تعمیر ہوئی تھی۔"(10)

اس کے علاوہ امام بارگاہ کلان سکردو، کھر گرونگ، لاسوپی، گنگوپی اور الڈینگ وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔ ان مقامات کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہبی عبادت گاہیں کس طرح وقت کے ساتھ مقامی سماج میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے۔ امام بارگاہوں کی تاریخی اہمیت کو محض مذہبی عمارات تک محدود نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ مذہبی رسوم، اجتماعات، اجتماعی یادداشت اور نسل در نسل منتقل ہونے والی روایات کے مراکز بھی ہیں۔ اس لیے ان کی تاریخ دراصل بلتستان کی سماجی اور ثقافتی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔

مصنف امام بارگاہوں کے فنِ تعمیر پر مذہبی روایت کے اثرات کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"واقعہ کربلا نے جس طرح دنیا بھر کے ادب شاعری کا شعبہ متاثر کئے بغیر نہیں چھوڑا اسی طرح مجالس عزا کی وجہ سے دنیا کے طول و عرض میں بالعموم اور بلتستان میں بالخصوص فن تعمیر بھی اس سے خاطر خواہ متاثر ہوا ہے۔ محرم واسد کی مجالس برپا کرنے کے لیے جو مقام تعمیر کیا جاتا ہے، اسے یہاں ماتم سرا یا امام باڑہ کہا یا امام بارگاہ کہا گیا۔ ان امام بارگاہوں کی تشکیل نے یہاں فن تعمیر پر قابل ذکر حد تک اثرات مرتب کیے ہیں۔ دراصل یہ امام بارگاہیں اس جمالیاتی ذوق کی آسودگی کی شاہکار ہیں جو صرف اور صرف عوامی ہے جن کو امام حسین اور ان کے اعزاء سے بے پایاں محبت و عقیدت ہے۔"(11)

اسی تسلسل کو امام بارگاہ کلان کے تاریخی پس منظر سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ

"سکردو اور گردونواح کے خطوں میں امام بارگاہیں، مسجدیں اور خانقاہیں تو اسلام کی اشاعت کے ساتھ ہی قائم اور آباد تھیں لیکن ان میں محض اپنے اپنے گاؤں کی سطح پر مجلس برپا ہوتی تھی۔ راجہ احمد شاہ مقپون (1800 تا 1840) کی خواہش تھی کہ سکردو کے قلب میں ایک ایسا امام باڑہ تعمیر کیا جائے جس میں زیادہ سے زیادہ اجتماعات ہوں۔

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

چنانچہ قلعہ کھرپوچھے کے قریب ریگستان کے کنارے امام باڑہ کلان کی بنیاد رکھی گئی۔"(12)

یہاں مذہبی اداروں کا ذکر ہمیں بلتستان کی سیاسی تاریخ کی طرف بھی لے جاتا ہے، کیونکہ دین، سیاست اور فنِ تعمیر یہاں ایک دوسرے سے جدا جدا نہیں بلکہ باہم وابستہ نظر آتے ہیں۔اسی پس منظر میں بلتستان کے قلعے اور شاہی محلات خاص اہمیت حاصل کرتے گئے۔باب ہشتم میں دس نمایاں قلعوں اور محلات کا حالات پیش کیا گیا ہے۔یہ قلعے اور محلات محض حکمرانوں کی سکونت یا دفاعی ضرورت پوری کرنے والی عمارات نہیں تھے بلکہ سیاسی طاقت، انتظامی نظام، سماجی درجہ بندی اور مقامی فنِ تعمیر کی ترجمانی بھی کرتے تھے۔

بلتستان کے قدیم قلعوں میں قلعہ کھرپوچو کو خاص مقام حاصل ہے۔اس ضمن میں مصنف لکھتے ہیں کہ

"وادی سکردو کے عین وسط میں بجانب شمال ایک سنگلاخ واقع ہے جس کی عمودی چٹان پر بلتستان کا عظیم قلعہ کھرپوچو اپنے سینے میں سیکڑوں تاریخی و تہذیبی داستانیں چھپائے خاموش کھڑا ہے۔یہ قلعہ بلتستان کے تابناک ماضی اور عظمت وسطوت کا امین ہے جو یہاں قلعوں کا بادشاہ کہلاتا ہے۔یہی بلتستان کی عظمت رفتہ کا تاج محل کہلاتا ہے۔

اکثر مورخین کے مطابق یہ قلعہ مقپون بوخا(1490ءتا1515ء) کے دور میں تعمیر کیا گیا تھا اور 1588تا1625ء کے دوران علی شیر خان انچن نے اسے مزید وسعت دی جبکہ بعض مغل مورخ اس کی تعمیر کا سہرا علی شیر خان کے انچن کے سر باندھتے ہیں۔"(13)

قلعہ کھرپوچو کی مثال سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ کسی تاریخی عمارت کو محض اس کی تعمیر کی تاریخ تک منحصر نہیں کیا جا سکتا۔اس کی حقیقی قدر اس سیاسی، معاشرتی اور تمدنی ماحول میں مخفی ہوتی ہے جس میں وہ موجود رہی۔اسی لیے مصنف جب بلتستان کے دیگر قلعوں اور محلات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے وسیلے سے پورے سماج کی تصویر سامنے لانے کی کاوش کرتے ہیں۔اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ :

"بلتستان کے قلعے و محلات یہاں کے راجاؤں کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا مرقع تھے اور ہیں۔شروع میں یہ قلعے دفاعی نقطۂ نگاہ سے اونچے پہاڑ کی چوٹیوں پر بنائے جاتے رہے جو بڑے مضبوط اور مستحکم ہوتے تھے اور ان کو آسانی سے فتح نہیں کیا جا سکتا تھا۔یہ محلات اور قلعے صرف راجہ اور ان کے خاندان کی رہائش گاہ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں وزراء، فوج اور انتظامیہ کے دفاتر بھی ہوا کرتے تھے۔"(14)

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

قلعوں اور محلات کے بعد کتاب کا دائرہ مزید جامع ہوتا ہے اور مصنف زیارت گاہوں اور آستانوں کی طرف بڑھتے ہیں۔اس طرح مذہبی تاریخ کا وہ رخ سامنے آتا ہے جو کسی خاص مسجد، خانقاہ یا امام بارگاہ سے وسیع ہو کر شخصیات، مزارات اور مقامی عقیدت کے مقامات سے منسلک ہے۔کتاب کے باب نہم میں بلتستان کی متعدد زیارت گاہوں اور آستانوں کی بنیاد، قیام کی تاریخ اور ان سے وابستہ روایات و تاریخی پس منظر کا احوال پیش کیا گیا ہے۔ان مقامات کی مذہبی، روحانی، تاریخی اور ثقافتی اہمیت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔آستانہ سید علی طوسی کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں کہ :

"سید علی طوسی کا آستانہ کوارد و میں ہے جس پر سن وفات ۱۰۸۱ ہجری مرقوم ہے۔آستانہ سید علی طوسی کی مناسبت سے کوارد و کا یہ محلہ 'آستانہ' کہلاتا ہے۔مزار کے ساتھ ہی مسجد واقع ہے جس کی بنیاد سید علی طوسی نے رکھی تھی۔اب یہ مسجد چند سال قبل دوبارہ تعمیر ہو گئی ہے۔"(15)

آستانہ سید محمود طوسی کے حوالے سے لکھتے ہیں

"سید محمود طوسی کا آستانہ سکردو چھومک سے متصل کشو باغ میں واقع ہے جہاں سنگ مرمر کی بڑی لوح نصب تھی اور اس پر قرآنی آیات و فارسی اشعار کندہ تھے۔اب لوح ٹوٹ گئی ہے اور صرف یہ ایک شعر پڑھا جاتا ہے۔شاعر کے بارے میں علم نہیں۔

بود تاریخ سال ارتحالش ز ھجری از بھشت عدن آمد ز ھجری از بھشت عدن آمد"

مصنف کے مطابق اس شعر سے سید محمود طوسی کی تاریخِ وفات ۸۸۴ ہجری نکلتی ہے۔ " (16)

اسی طرح شیخ علی برولمو کے آستانے کے بارے میں یوں لکھتے ہیں کہ

"حجت الاسلام شیخ علی کا آستانہ کھرمنگ برولمو میں پاک بھارت کی عین سرحد پر واقع مرجع خاص و عام آپ فاضل نجف تھے اور صاحب کشف و کرامات علم و عمل اور زہد و تقوی میں یکتائے روزگار ہے۔اس لیے پاک فوج اور بھارتی فوج دونوں کے لیے آپ کی ذات قابل احترام تھی۔آپ نے ۱۰ فروری ۱۹۷۴ء مطابق ۷ محرم الحرام ۱۳۹۴ھ کو برولو میں داعی اجل کو لبیک کہا۔جہاں آپ مدفن ہوئے وہ جگہ اب ایک زیارت گاہ ہے۔"(17)

قتل گاہ شریف کے بارے میں روایت بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ

"روایت کے مطابق یہ شبیہ قتل گاہ ۱۸۰۰ تا ۱۸۴۰ء کے دوران والی سکردو راجہ احمد شاہ مقپون کے دور حکومت میں وجود میں آئی۔کہا جاتا ہے کہ راجہ احمد شاہ قلعہ کھرپوچھے میں قیام پذیر تھے کہ ایک دفعہ رات کو انہوں نے موجود قتل گاہ کے حدود میں شمع جلتے ہوئے اور زمیان اترتے ہوئے دیکھا جو اُس وقت لق و دق صحرا تھا۔

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

چنانچہ راجہ احمد شاہ نے اس جگہ شبیہ قتل گاہ بنانے کا حکم صادر کیا۔ شروع میں گنج شہدا کے قبور کی شبیہ کے طور پر سادہ طریقے سے ریت کے ماڈلز کے اوپر چادریں ڈال کر چند علم نصب کیے گئے تھے پھر ۱۳۱۰ ہجری میں اس کی تعمیر ثانی ہوئی۔ پاکستان بننے کے چند سال بعد قتل گاہ شریف کے پورے حدود کی باقاعدہ چار دیواری کی گئی۔"(18)

ایسی نوعیت کی روایتیں بلتستان کی تمدنی تاریخ کو صرف عمارات کی تاریخ نہیں رہنے دیتیں بلکہ اسے انسانی عقیدت، یادداشت اور جذبات سے مربوط کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی تاریخی مقام کا جائزہ کرتے ہوئے اس سے متعلق مقامی روایت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ تحقیقی سطح پر اس روایت کو دوسرے تاریخی ثبوت کے ساتھ جانچنا اہم ہے۔ اسی مشترکہ معاشرتی زندگی کا کسی حد تک نسبتاً مختلف مگر نہایت اہم رخ بلتستان کی چوپالیں ہیں۔ کتاب کے آخری حصے میں حسن حسرت نے بلتستان کے مشہور چوپالوں کا خوب صورت اور دل نشیں طریقے سے ذکر کیا ہے۔ یہ چوپالیں صرف بیٹھک یا ملاقات کی جگہیں نہیں تھیں بلکہ مقامی معاشرت، اجتماعی زندگی، باہمی میل جول، مشاورت اور تہذیبی و تمدنی سرگرمیوں کا اہم محور تھیں۔ بلتستان کی معاشرتی زندگی میں چوپال کو ممتاز اہمیت حاصل رہی ہے۔ ماضی میں تقریباً ہر گاؤں میں ایسی جگہ ہوتی تھی جہاں لوگ مل بیٹھ کر اپنے روزمرہ معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔ بلتی زبان میں اسے ''بلیچنگر'' کہا جاتا ہے۔ راجگی اور ڈوگرہ دور میں بھی چوپال کی یہ سلسلہ برقرار رہی، جبکہ عموماً وہاں چنار کے درخت لگائے جاتے تھے تاکہ لوگوں کو سایہ میسر ہو۔ چوپالیں محلے، گاؤں اور علاقے کی سطح پر موجود ہوتی تھیں۔ یہاں سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر بات چیت، باہمی تنازعات کے تصفیہ اور مقامی معاملات کے فیصلے کیے جاتے تھے۔ لوگ فرصت میں بھی یہاں جمع ہو کر حالاتِ حاضرہ پر گفتگو اور تفریح کرتے تھے۔ یوں چوپال محض ایک جگہ نہیں بلکہ ایک ایسا معاشرتی ادارہ تھی جہاں مقامی سماجی شعور پروان چڑھتا تھا۔ موسیقی، طنز و مزاح، محاورے، ضرب الامثال اور علم و دانش کی باتیں بھی انہی محفلوں کے ذریعے عام ہوتی رہیں۔ بلتستان کے مشہور چوپالوں میں سکردو کا غوتی ہلچنگرہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس اس ضمن میں مصنف لکھتے ہیں کہ :

"بلتستان کے چوپالوں میں سکردو کا غوتی ہلچنگرہ نامی چوپال تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ متعدد بلتی لوک گیتوں میں اس چوپال کے تذکرے جابجا ملتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ چبوترہ راجہ غوطہ چوسنگے نے 1443 تا 1446 کے دوران بنوایا تھا اور انہی کے نام سے منسوب کر کے غوتی ہلچنگرہ رکھا گیا مگر بعد میں کثرت استعمال سے یہ غوڑی ہلچنگرہ یعنی گونگے کا چوپال پڑ گیا۔ بعض مورخین کے مطابق یہ چوپال مقپون راجہ شیر علی خان انچن کی رانی گل خاتون نے اس وقت تعمیر کرایا تھا

OPEN ACCESS
CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

جب عظیم راجہ علی شیر خان انچن گلگت و چترال کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔تاہم روایت کے مطابق اس وقت اس کا رقبہ کم و بیش پندرہ کنال پر محیط تھا۔یہ چوپال سکردو میں کھرپوچو قلعہ کے دامن میں بجانب جنوب واقع ہے اور اہلِ ذوق و نظر کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔"(19)

مصنف چوپال اور ان کے قریبی مقامات کا ذکر کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ

"اس چوپال کے ایک طرف ہلال باغ اور دوسری طرف مقپون شہزادیوں کے لیے بنایا گیا گل میندوق کھر دونوں شکست و ریخت اور زوال کے مناظر پیش کر رہے ہیں جبکہ غوتی بلیچنگرہ سے متصل مقپون حکمرانوں کا شاہی قبرستان پھیلا ہوا ہے۔غوتی بلچنگرہ کے نشیب میں بلتستان کے عظیم فاتح علی شیر خان انچن کے دور میں تعمیر کیا گیا شاہی پولو گراؤنڈ موجود ہے۔"(20)

غوتی بلیچنگرہ کی مثال سے یہ بات اچھی طرح نمایاں ہوتی ہے کہ ایک ہی تاریخی مقام کے آس پاس کسی خطے کی سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کے کتنے پہلو اکھٹے ہو سکتے ہیں۔یہی وہ مقام ہے جہاں ''نقوشِ بلتستان'' کا مرکزی خیال یعنی مادی اور غیر مادی تہذیبی ورثے کا باہمی تعلق مکمل طور پر سامنے آتا ہے۔تہذیبی ورثے کی اس پوری بحث میں اجتماعی حافظہ ایک اساسی حیثیت رکھتا ہے۔کسی سماج کے تاریخی مقامات اس کی اجتماعی یادداشت کی ظاہری صورت ہوتی ہیں۔ایک قدیم مسجد کسی خاندان، محلے یا گاؤں کی مذہبی تاریخ سے متعلق ہو سکتی ہے، ایک خانقاہ کسی روحانی روایت کی نشانی بن سکتی ہے، ایک امام بارگاہ مذہبی اجتماعات اور نسلوں تل منتقل ہونے والی یادوں کا مرکز ہو سکتی ہے، جب کہ ایک قلعہ کسی حکمران یا تاریخی واقعے کی یاد اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہو سکتا ہے۔اس لحاظ سے تاریخی مقامات صرف ماضی کی آثار نہیں بلکہ حال کے تہذیبی شعور کو تشکیل دینے والے عوامل بھی ہیں۔مصنف نے ان مقامات کو تحریری شکل دے کر مقامی تاریخی حافظے کو محفوظ کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔خصوصا بلتستان جیسے خطے میں جہاں بہت سی تاریخی روایات تحریری کتابوں کے بجائے زبانی روایت کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوتی رہی ہیں، ان روایتوں کو قلم بند کرنا آئندہ تحقیق کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔تاہم تحقیقی سطح پر زبانی روایت کو یقینی تاریخی حقیقت قرار دینے کے بجائے ایک ذریعہ سمجھ کر دوسرے تاریخی ثبوت کے ساتھ جانچنا اہم ہے۔ ''نقوشِ بلتستان'' میں موجود ایسی روایتیں آئندہ محققین کے لیے ایک کارآمد ابتدائی مواد مہیا کرتی ہیں۔مصنف کے اسلوب کی بات کی جائے تو ان کی اہم خصوصیات ان کا سلیس، سہل اور عام فہم اندازِ بیان ہے۔وہ کٹھن اصطلاحات اور مشکل جملوں کے بجائے نسبتاً سادہ اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں۔اس وجہ سے ''نقوشِ بلتستان'' صرف ماہر محققین کے لیے نہیں بلکہ عام قارئین کے لیے بھی قابلِ فہم بن جاتی ہے۔تاریخی

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

موضوعات کو سادہ انداز میں پیش کرنا اس کتاب کی ایک اہم خصوصیات ہے، خاص طور سے ایسے موضوع پر جس میں خشک تاریخی معلومات قاری کی دلچسپی کم کر سکتی ہیں۔

مصنف کی کتاب کے حوالے سے شاہر اشاہد ایگزیکٹو ڈائریکٹر رقمطراز ہیں کہ

"زیر نظر کتاب پاکستان کے خوبصورت شمالی علاقے بلتستان کے روایتی اور تاریخی طرز تعمیر سے متعلق گرانقدر معلومات پر مشتمل ہے۔ خاص طور پر روایتی طرز تعمیر سے دلچسپی رکھنے والوں اور فن تعمیر کے طالب علموں کے لیے یہ ایک بہت مفید کتاب ہے۔ اس کے مصنف محمد حسن حسرت صاحب اپنی ادبی و علمی خدمت کے سبب بلتستان، سکردو میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ لوک ورثہ کے تحت شائع ہونے والے شمالی علاقہ جات کے ثقافتی انسائیکلوپیڈیا میں حصہ بلتستان محمد حسن حسرت صاحب ہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔"(21)

اگر تنقیدی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ''نقوشِ بلتستان'' میں مزید بہتری کی امکان بھی موجود ہے۔ بعض مقامات پر حوالہ جات کو زیادہ منظم انداز میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ تاریخی دعووں کے ساتھ بنیادی ماخذ کی مکمل نشان دہی کی جاتی تو کتاب کی تحقیقی حیثیت مزید مضبوط ہوتی۔ اسی طرح تاریخی مقامات کے سماجی، ثقافتی اور معاشی تاثرات پر مزید تفصیلی تجزیہ شامل کیا جاتا تو کتاب کی تحقیقی معنویت میں اضافہ ہوتا۔ بعض تاریخی روایات کو دوسرے ذرائع کے ساتھ ملا کر دیکھنے کی حاجت بھی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مقامی روایت اپنی جگہ اہم ہوتی ہے لیکن تحقیقی تاریخ نویسی میں اس کی تصدیق اور موازنہ بھی اہم ہے۔ ان حدود کے باوجود ''نقوشِ بلتستان'' کی بنیادی اہمیت متاثر نہیں ہوتی۔ اس کتاب کا اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس نے بلتستان کے متعدد تاریخی مقامات کو ایک جگہ جمع کر کے ان کے بارے میں بنیادی معلومات مہیا کی ہیں۔ یہ کام خاص طور پر مقامی تاریخ کے اعتبار سے اہم ہے۔ کیونکہ بڑے تاریخ کے بڑے بیانات میں بعض اوقات مقامی باقیات اور مقامی روایات کو وہ جگہ نہیں مل پاتی جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں۔ حسن حسرت نے اپنے علاقے کے تاریخی ورثے کو موضوع بنا کر مقامی تاریخ نویسی کی سلسلہ کو مستحکم کیا ہے۔

اس کتاب کی علمی اہمیت اس بات میں بھی مخفی ہے کہ یہ آئندہ تحقیق کے لیے کئی جہتیں کھولتی ہے۔ مساجد کے حوالے سے فنِ تعمیر اور مذہبی تاریخ پر مزید کام کیا جا سکتا ہے، خانقاہوں کے حوالے سے روحانی اور سماجی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے، امام بارگاہوں کے بارے میں مذہبی رسوم اور اجتماعی حافظے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، جب کہ قلعوں اور محلات کے حوالے سے سیاسی تاریخ، فنِ تعمیر اور مقامی حکمرانی کے نظام کو موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح چوپالوں کے حوالے سے بلتستان کی

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

غیر مادی تہذیب، لوک ادب، موسیقی، سماجی مشاورت اور مقامی اجتماعی زندگی پر مزید تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ اس طرح ''نقوشِ بلتستان'' کو ایک اختتامی کتاب کے بجائے آئندہ تحقیقات کے لیے بنیادی نقطۂ آغاز سمجھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس پورے مطالعے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ''نقوشِ بلتستان'' بلتستان کے تاریخی اور تہذیبی ورثے کی ایک اہم دستاویزی کاوش ہے۔ حسن حسرت نے تاریخی عمارات اور مقامات کو محض جدا جدا آثار کے طور پر پیش کرنے کے بجائے انہیں بلتستان کے وسیع تر تاریخی منظر نامے میں جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ مساجد، خانقاہیں، امام بارگاہیں، قلعے اور محلات بلتستان کی مذہبی، سیاسی اور سماجی تاریخ کے مختلف پہلو سامنے لاتے ہیں، جب کہ زیارت گاہیں، آستانے اور چوپالیں اس تاریخ کے ان پہلوؤں کو محفوظ کرتی ہیں جو عام سیاسی تاریخ میں اکثر نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

کتاب کا سادہ اسلوب اسے عام قاری کے لیے قابلِ فہم بناتا ہے، جب کہ اس میں موجود معلومات، مقامی روایات اور تصاویر آئندہ محققین کے لیے بنیادی مواد فراہم کرتی ہیں۔ اگرچہ حوالہ جاتی نظام، تاریخی دعووں کی تقابلی جانچ اور سماجی و ثقافتی اثرات کے تجزیے کو مزید وسعت دینے کی ضرورت موجود ہے، لیکن ان حدود کے باوجود کتاب اپنی بنیادی دستاویزی اہمیت برقرار رکھتی ہے۔ بلتستان کے تہذیبی ورثے کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ تاریخی مقامات کی باقاعدہ دستاویز بندی کی جائے۔ قدیم مساجد، خانقاہوں، امام بارگاہوں، قلعوں اور محلات کے کتبوں اور تعمیراتی خصوصیات کو محفوظ کیا جائے اور زبانی روایات کو بھی تحقیقی اصولوں کے مطابق ریکارڈ کیا جائے۔ مقامی آبادی، تعلیمی اداروں، محققین اور متعلقہ ثقافتی اداروں کو اس عمل میں شریک کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تاریخی عمارات کی مرمت میں بھی اصل تعمیراتی خصوصیات کو محفوظ رکھنے پر توجہ دی جانی چاہیے تاکہ جدید تعمیر کے نام پر تاریخی شناخت متاثر نہ ہو۔ اسی طرح بلتستان کے تہذیبی ورثے پر اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور مقامی زبانوں میں بھی تحقیقی مواد تیار کیا جانا چاہیے تاکہ یہ علمی سرمایہ وسیع تر سطح پر متعارف ہو سکے۔ حسن حسرت کی ''نقوشِ بلتستان'' ہمیں اپنے ماضی سے جوڑنے کے ساتھ یہ احساس بھی دلاتی ہے کہ تہذیبی ورثہ صرف پرانی عمارات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک قوم کے اجتماعی حافظے، تاریخی شعور اور شناخت کا حصہ ہوتا ہے۔ بلتستان کے قلعے، محلات، مساجد، خانقاہیں، امام بارگاہیں، زیارت گاہیں اور چوپالیں اپنے اندر صدیوں کی تاریخ، مذہبی روایت، سیاسی تجربات اور سماجی زندگی کے آثار محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ ان آثار کو محفوظ کرنا دراصل اپنی تاریخی شناخت کو محفوظ کرنا ہے۔ اسی اعتبار سے ''نقوشِ بلتستان'' کو صرف تاریخی مقامات کی فہرست یا تعارفی کتاب سمجھنا اس کی معنویت کو محدود کرنا ہوگا۔ یہ کتاب بلتستان کے اجتماعی حافظے کو قلم بند کرنے، مقامی تاریخ کو محفوظ کرنے اور اس خطے کی تہذیبی شناخت کو سمجھنے کی ایک اہم کوشش ہے۔ حسن حسرت نے اپنے علاقے کے ماضی کو ان مقامات، عمارات اور روایات کے

CC BY

Al-Asr International Research Journal of Islamic Studies
Vol 6 Issue 10 | October 2026
ISSN E: (2790-7694)
ISSN P: (2790-7686)
Published:
October 31, 2026

ذریعے ہمارے سامنے رکھا ہے جو آج بھی بلتستان کی اجتماعی زندگی میں کسی نہ کسی صورت موجود ہیں۔اس لیے ''نقوشِ بلتستان'' نہ صرف بلتستان کے تہذیبی و ثقافتی ورثے کی حفاظت کی ایک قابلِ قدر علمی کاوش ہے بلکہ یہ آئندہ نسلوں اور محققین کے لیے اس ماضی تک پہنچنے کا ایک اہم دروازہ بھی ہے۔

حوالہ جات

1. آرنلڈ جے۔ٹائن بی، مطالعۂ تاریخ، ترجمہ: غلام رسول مہر، جلد/حصہ، (مجلس ترقی ادب، لاہور، 1964، طبع دوم)، ص21
2. سید سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، (کراچی، مکتبہ دانیال، 1977)، ص13
3. جمیل جالبی، پاکستانی کلچر، (مشتاق بک ڈپو، کراچی، 1964)، ص31
4. فیض احمد فیض، ہماری قومی ثقافت، (ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، 1976)، ص31
5. محمد حسن حسرت، نقوش بلتستان، (اسلام آباد، لوک ورثہ کا قومی ادارہ، 2019)، ص48
6. ایضا، ص49
7. ایضا، ص72
8. ایضا، ص70
9. ایضا، ص74
10. ایضا، ص90
11. ایضا، ص90
12. ایضا، ص91
13. ایضا، ص101
14. ایضا، ص90
15. ایضا، ص125
16. ایضا، ص126
17. ایضا، ص141
18. ایضا، ص150
19. ایضا، ص153
20. ایضا، ص153
21. ایضا، ص1

OPEN ACCESS
CC BY